بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا ہے؛ اُسکے شکریے میں یہ رباعی لکھی ہے۔ بڑا فیروزہ جو بیضوی شکل کا ہوتا ہے وہ سیم کے بیج سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔

نثر اردو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے؛ مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اُسوقت بضرورت اُنکو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُنکی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اُسوقت اُنکو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی - اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں - شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے

مضمحل ہو گئے قوےٰ غالب   اب عناصر میں اعتدال کہاں"

غالباً اُردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے وہی اُسکی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُنکی

اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے؛ اور اُنکے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی تبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے؛ مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جنپر مجھکو ناز ہے کوئی اُنکا لطف نہیں اُٹھاتا مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے۔ دادِ سخن کہاں اور ادراک پایۂ معنی کہاں؟ تاریخ تمریہ (یعنی مہر نیمروز) کے پانسات جزو جو آپکے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجیے؛ انصاف سے کہیے کہ یہ نثر کیسی اور ہے؟ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق نہو"

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض اوشل تحریروں میں دیکھا گیا کہ اُردوے معلی اور بوستان خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے؛ لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدر دان بہ نسبت ناقدر دانوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں، چند تقریظیں اور دیباچے ہیں؛ اور تین مختصر رسالے ہیں - جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں؛ لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامۂ غالب۔ اسکے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں - جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ اِن میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطف انگیز اُنکے خطوط ہیں جنمیں سے زیادہ تر اُردوے معلی میں اور اُس سے کم عودِ ہندی میں جمع کرکے چھپوائے گئے ہیں۔ اور بہت سے خطوط اِن دونو کتابوں کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوئے ہیں - جو اب تک شائع نہیں ہوئے مگر عنقریب بعض احباب کا ارادہ اُنکے چھپوانے کا ہے۔

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا؛ اور نہ اُنکے بعد کسی سے اُسکی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ اُنھوں نے القاب و آداب کا پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور اور بہت سی باتیں جنکو مترسلین نے لوازمِ نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں، کبھی برخوردار، کبھی بھائی صاحب، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں؛ اُسکے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُنکو یہ لکھنا تھا کہ "محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گذرا۔ مینے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اُسنے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائینگی؟ اُسنے کہا آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے" اِس مطلب کو اُنھوں نے اِسطرح ادا کیا ہے "محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ۔ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائینگی؟ آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے۔"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے؛ اُسمیں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور اُنسے یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اِس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُسکو اِسطرح شروع کرتے ہیں "اے میرن صاحب السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھدیتا ہوں؛ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب اُسکے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں وہ خفا ہوا ہوگا؛ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپکے

فرزند ہیں آپ سے خفا کیا ہونگے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اُٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں؛ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھئے گا۔ میاں بیٹھو، ہوش کی خبر لو؛ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ! میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولاقوۃ" اِسکے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُسکو غائب فرض کر لیتے ہیں؛ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیان سے واقف نہیں وہ اُسکو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں "میر مہدی! جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا ہے۔ سنو دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی؛ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لیگیا، مگر میں نے اُسکو بحل کیا؛ اللہ برکت دے"

ظاہر ہے کہ اِس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں؛ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی سے اُسکے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اِس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے —

اِن الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر اُن کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے؛ میری نسبت نہیں لکھا؛ اُسی قدر اُنکو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں از راہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں اُنیں اکثر اِس قسم کے سوال وجواب ہوتے ہیں جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال وجواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُنکے ناموں کی کوئی علامت لکھدی جاتی ہے؛ ورنہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا؟ اور جواب کہاں سے شروع ہوا؟ مرزا ایسے موقع پر سائل ومجیب کا نام نہیں لیتے؛ اور نہ اُنکے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ سوال کیا ہے؟ اور جواب کیا؟ شاید قصے یا نوِل میں یہ بات نہ چل سکے؛ مگر خطوط میں تو مرزا نے یہ راہ بالکل صاف کردی ہے۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اُسکی پیروی نکرسکیں؛ مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو نوِل اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق ومہارت یا پیروی وتقلید سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے؛ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی وظرافت پر رکھنی چاہی ہے مگر اُنکی اور مرزا کی تحریریں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہُوئے ہوتے ہیں؛ اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے اُسکو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اُردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، تو تمسکل

سوشل، اور دلچسپ مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دیے ہیں، بایوگرفی اور نوِل میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں؛ باوجود اِسکے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطفِ بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اِس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُسکو پڑھکر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا اُسکی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے؛ اُسمیں اُن کی لڑکی کو۔ جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہوگئی ہے۔ بعد دعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی اب ہم اگر کول آئے بھی تو تمکو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمھارے مُلک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟" یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جواب رئیس لوہارو ہیں۔ اُنکے بچپن کے زمانے میں اُنکے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اِس طرح لکھتے ہیں "اے مردمِ چشم جہاں بینِ غالب۔ ایسے القاب کے معنی سمجھ لو؛ یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی تپلی۔ چشمِ جہاں بیں تمھارا باپ مرزا علاؤ الدین احمد خاں بہادر۔ اور پتلی تم۔ میاں تمھارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں؛ میں تو صرف تمھارا دل دادہ ہوں۔

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے اُنھوں نے اُسکا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا اُسکے جواب میں اُنکو اِس طرح لکھتے ہیں "دیکھو صاحب یہ باتیں ہمکو پسند نہیں؛ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو؛ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائیگا تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے"

شوخی

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے ؛ اُس میں لکھتے ہیں " دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں ؛ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں ؛ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے ؛ اور روزہ بہلانا اور بات ہے "

جس زمانے میں برہانِ قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلف برہان کی حمایت کی ہے ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُسکی اور اُسکے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں " اِن فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا وہ لکھدیا۔ نظامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُسکو مانیں ؛ ہندیوں کو کیونکر مسلّم الثبوت جانیں۔

لطیفہ

ایک گائے[†] کا بچہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا ؛ بنی اسرائیل اُسکو خدا سمجھے "

ایک خط کے آخر میں جو نواب علاؤ الدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں " اُستاد میرجان کو اِس راہ سے کہ میری پھپھی اُنکی چچی تھیں اور یہ مجھسے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اِس رُو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی و بیشیِ سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اِس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں۔ بندگی۔ اور اِس نظر سے کہ یہ سید ہیں۔ درود۔ اور موافق مضمون اِس مصرع کے " سوے اللہ واللہِ مافی الوجود " سجود "

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں " دیوانخانے کا حال محلسرا سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا ؛ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے ؛ ابر دو گھنٹے

† یہ اشارہ صاحب برہانِ قاطع کی طرف ہے ۱۲

برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے "

نواب علاؤ الدین خاں اور اُنکے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاؤ الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں " سُنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزولِ اجلال کیا۔ پہر دن رہے ازراہِ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے ۔۔۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے ؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اِس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اتنا ہی ؟ جتنا تم اُسکو چاہتے ہو۔ ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر اُنکو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے "

ایک دفعہ کثرتِ اخراجات سے تنگ آکر بعض ضروری خرچ بند کر دئے ہیں یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے نواب علاؤ الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اِسکا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے " چوں پیرشدی حافظ از میکدہ بیروں شو الخ " اُسکا جواب اِس طرح لکھتے ہیں " بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو جا مارا، اِدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی ؛ ہر ایک پاس تمسک مُہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو نہ مول نہ سود۔ اِس سے بڑھکر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل بھیّا کے سر ؛ باایں‌ہمہ کبھی خان نے کچھ دیدیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے، سَو روپے رام پور کے ؛ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار وہ سُود ماہ بماہ لیا چاہے، مُول میں قسط اُسکو دینی پڑے ؛ اِنکم ٹکس جدا، چوکیدارہ جدا، سود جدا، مول جدا،

بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمدہی ایک سو باسٹھ[۱۶۲]، تنگ آگیا، گذارا مشکل ہوگیا؛ روزمرہ کا
کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش صبح کی
تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینا بچا،
روزمرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے
پوچھا کہ نہ پیوگے تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گذرا تھا
کہ رامپور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہوگیا۔ متفرق رہا؛ خیر رہو۔ صبح کی
تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی
انکو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا۔"

اے بخبر زلذتِ شربِ مدامِ ما" دیکھا ہمکو یوں پلاتے ہیں۔ دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر
مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے؛ اور عرفا کے
کلام سے حقیقت حقہ وحدتِ وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک
جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں
کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں
زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں؛ اور دل میں لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں
انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم
ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ
ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام" بریں

زیستم ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور
اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن
ہونگا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کرونگا؛ تاکہ مشرکین نبوتِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اسمیں جلیں ++++
سنو! مولوی صاحب کتنے کئی فاقوں میں۔ ایک شعر حافظ کا حفظ کیا "چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں آ" الخ
اور پھر پڑھتے ہو اسکے سامنے کہ اسکی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دو چند سہ چند ہے؛ مجموعہ نثر جداگانہ؛
اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اسکے مخالف ہیں"

ایک خط میں تعلقاتِ خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں "سنو! عالم دو ہیں؛ ایک عالمِ ارواح
اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم اِن دونو عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے "لمن الملک الیوم" اور پھر
آپ ہی جواب دیتا ہے "للہ الواحد القہار" ہرچند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح
میں سزا پاتے ہیں؛ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیجکر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ
میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات
میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوامِ حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے
پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں تقرر کیا؛ اور مجھے اس زنداں میں ڈالدیا۔ فکرِ نظم و نثر کو مشقت
ٹھیرایا۔ برسوں کے بعد میں جیلخانے سے بھاگا؛ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے
کلکتے سے پکڑ لائے؛ اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتھکڑیاں[†] اور

[†] بیڑی سے مراد اہلیہ اور دو ہتھکڑیوں سے مراد حسین علی خاں اور باقر علی خاں جنکو مرزا نے انکے والد زین العابدین خاں کی
وفات کے بعد خود فرزندوں کی طرح پرورش کیا تھا۔"

بڑجاویں۔ پانو بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں؛ سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونو ہتکڑیوں کے بھاگا؛ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا؛ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگونگا بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اِس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤنگا۔ فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں دوم + سوی شہر خود ازیں وادیِ ویراں بروم +

ایک خط مرزا حاتم علی بیگ مہر کو اُنکی محبوبہ چنا جان کی تعزیت میں لکھا ہے اسمیں لکھتے ہیں "آپ کا غم فزا نامہ پہنچا۔ یوسف علی خان عزیز کو پڑھوا دیا۔ اُنھوں نے جو میرے سامنے اُس مرحومہ کا اور آپکا معاملہ بیان کیا یعنی اُسکی اطاعت اور تمھاری اُس سے محبت سخت ملال ہوا۔ سنو صاحب شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جاوے فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؒ سے ٹکر کھائے عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو۔ لیلی اُسکے سامنے مری تھی تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اُس سے بڑھکر ہوئے کہ لیلی اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جسپر مرتے ہیں اُسکو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک + + + کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا اُن دونو کو بخشے اور ہم تم دونو کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا؛ اس فن سے میں بیگانۂ محض ہو گیا ہوں، لیکن کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اُسکا مرنا زندگی بھر نہ بھولونگا۔ جانتا ہوں کہ تمھارے دل پر کیا گذرتی ہوگی

صبر کرو اور ہنگامۂ عشق مجازی چھوڑو۔ سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی + عشق محمد بس است و آل محمدؐ + اللہ بس ماسوائے ہوس۔

ایک اور خط مرزا صاحب موصوف کو اسی چنا جان کی تعزیت میں اس طرح لکھا ہے۔ "مرزا صاحب! ہمکو یہ باتیں پسند نہیں پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدای شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی تھی۔ کہ ہمکو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانع فسق و فجور نہیں؛ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی؛ اقامت جاودانی ہے، اور اُسی ایک نیکبخت کے ساتھ زندگانی ہے؛ اس تصور سے جی گھبراتا ہے، اور کلیجا منھ کو آتا ہے۔ ہئے ہئے وہ حور اجیرن ہو جائیگی۔ طبیعت کیوں نہ گھبرائیگی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔

زنِ نو کن اے دوست ہر نوبہار   کہ تقویم پارینہ ناید بکار

مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اُسکی رسید اس طرح لکھتے ہیں "حلیۂ مبارک نظر افروز ہوا + + + تمھارا حلیہ دیکھکر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھکو رشک نہ آیا کسواسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کسواسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُسکی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر

سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھکو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی گھٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری؟ بقول شیخ علی حزیں

"تا دسترسم بود زدم چاک گریباں †   شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم"

"جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے؛ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام؛ مُلا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، مُنہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اُسی دن سر منڈایا"

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جنمیں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہوں یہاں تک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں "بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا؛ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی - کہ میں نے بچپن سے آج تک اسکو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھکو بیٹا سمجھتی تھی - مرگئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے؛ تین پھپھیاں، اور تین چچا، اور ایک باپ، اور ایک دادی، اور ایک دادا؛ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اُسکے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مرگئے"

ایک ایسی ہی افسردہ تحریر میں نواب امین الدین خاں کو لکھتے ہیں "آج تم دونو بھائی اس خاندان میں

† یہاں اس شعر کے لکھنے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جبتک مجھے موقع ملا برابر ڈاڑھی کا حق ادا کرتا رہا یعنی منڈاتا رہا پس اس سے میں کسی طرح شرمندہ نہیں ہوں"

شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو؛ میں لم یلد ولم یولد ہوں۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کو خط میں لکھتے ہیں "یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی؛ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں؛ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کرلیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا؛ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم (جیسا بادشاہوں کو بعد اُنکے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں) چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمروِ سخن جانتا تھا سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر!!! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں "اجی حضرت نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں؛ یہ کیا بیحرمتی ہو رہی ہے؛ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بیحیا، بے غیرت؛ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام؛ قرض لئے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دونگا"

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہوگیا ہے اُسکی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اسطرح لکھتے ہیں "صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش اُنکا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط؛ بعد چند

پھر دوسرا جنم ہمکو ملا۔ اگرچہ صورت اِس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے؛ یعنی ایک خط مَیں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اُسکا جواب مجھکو آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا۔ اور مَیں جس شہر میں ہوں اُسکا نام بھی دلّی اور اُس محلے کا نام بھی بلّی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان اِس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں''

ایک خط میں نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں ''کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے؛ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہونگے۔ اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جسمیں تم پیدا ہوے ہو، وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلّی نہیں ہے جسمیں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھسے پڑھنے آتے تھے، وہ دلّی نہیں ہے جسمیں مَیں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں؛ ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں ۔۔۔ امرای اہلِ اسلام میں اموات گنو تو حسن علیخاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپیہ روز کا پنشن دار۔ سو روپے مہینے کا روزینہ دار بنکر نامرادانہ مرگیا۔ میر ناصرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا؛ انجام کار مرگیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو تو ناظر حسین مرزا جسکا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا اُسکے پاس ایک پیسا نہیں ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بُدّھے صاحب ساری املاک بیچ کر و نوش جان کر کے

بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی؛ تباہ و خراب لاہور گیا؛ وہاں پڑا ہوا ہے؛ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلبھ گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جاے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیان واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے اُسکو بھی سچ جانو''

بعض خطوں میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا بیان نہایت موثر طریقے میں کیا ہے جس سے اُنکے خیالات معلوم ہوتے ہیں مثلاً

ایک خط میں لکھتے ہیں ''ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گرانجانی رکاب میں پانو ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر؛ اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے   مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں ''تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور مَیں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نامور ہوئے تو کیا اور گمنام جیے تو کیا۔ کچھ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی؛ باقی سب وہم ہے۔ اے یارِ جانی۔ ہر چند وہ بھی

وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھکر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے! اور وجہ معیشت اور صحت وراحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بیرنگی میں گذر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونو عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دئیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے پندار ہے۔ ہم تم دونو اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی وحافظ کے برابر مشہور ہوئے۔ اُنکو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہمکو تمکو ہوگا،،

مرزا نے بعض اُردو خطوں میں اور خاصکر اُردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفات باردہ میں شمار کیا جاتا ہے خصوصاً اُردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنّع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی مگر مرزا نے جس قسم کی مسجّع عبارت اُردو خطوں یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے اُسپر یہ گرفت مشکل سے ہوسکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجّع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اُسمیں تصنّع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ بسبب لزوم مالایلزم کے کم وزن ہو جاتا ہے مگر مرزا کی مسجّع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے جیسی پہلے فقرے میں اور یہ بات اسی شخص سے بن پڑتی ہے جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اسکی مثالیں لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو رقعات میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر یہ معلوم رہے کہ مقفیٰ عبارت مرزا خاصکر

اُن خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی یا ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے مثلاً سید یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں

"یوسف مرزا کیونکر تجھکو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودۂ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھسے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہونگا یوسف مرزا کو۔ تمھاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونو قیدوں سے چھوٹ گیا؛ نہ قیدِ حیات رہی، نہ قیدِ فرنگ،،

انھیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں "اے میری جان! اے میری آنکھو!

"ز ہجرانِ طفلے کہ در خاک رفت   چہ نالی کہ پاک آمد و پاک رفت

وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لیکر آیا تھا۔ یہاں رہکر کیا کرتا؟ ہرگز غم نکرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچے ہو خدا تمکو جیتا رکھے؛ اولاد بہت۔ نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم منجملۂ واقعات کربلائے معلّیٰ ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں اور ان سب میں مسجع و مقفےٰ عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے اُردو خطوں میں پائی جاتی ہے وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے؛ خصوصاً سجع کی رعایت نے اُن میں آورد اور تصنع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اسمیں معذور سمجھنا چاہئے؛ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ بغیر ان تکلفات بارِدہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے اُسکو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں اور مرزا کے وقت میں تو اسکا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

باایں‌ہمہ انہیں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو انھوں نے مفتی میرلال صاحب کی کتاب سراج المعرفۃ پر لکھا ہے اُس میں جس خوبی اور متانت سے تصوّف کے اعلےٰ خیالات ظاہر کئے ہیں اُسکے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان میں تصوّف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ اُسکے بعد ایسی عمدہ نثر میں کسی نے نہیں لکھے۔

کتاب سراج المعرفۃ۔ جسپر مرزا نے یہ دیباچہ لکھا ہے۔ اُسمیں مفتی میرلال نے مرحوم بہادر شاہ کے ایما سے تمام اشغال و اذکار۔ جو آنحضرتؐ کے زمانے سے اُسوقت تک سینہ بسینہ یا سفینہ بسفینہ چلے آتے تھے۔ ایک جگہ جمع کئے تھے۔ مرزا نے اپنے دیباچے میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفتِ الٰہی میں کیا دخل ہے؛ اور کیونکر انکے ذریعے سے توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے۔ دیباچۂ مذکور کا اوّل و آخر کا حصہ چھوڑ کر صرف وہ مقام جس میں مرزا نے مذکورۂ بالا مقصد کو بیان کیا ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا لکھتے ہیں کہ روحِ حق یوں ہے کہ حقیقت اندر دے شال ایک نامہ در ہم پیچیدہ سربستہ ہے کہ جسکے

عنوان پر لکھا ہے "لا موثر فی الوجود الا اللہ" اور خط میں مندرج ہے "لا موجود الا اللہ"، اور اس خط کا لانے والا اور اس راز کا بتانے والا وہ نامہ آور نام آور ہے کہ جسپر رسالت ختم ہوئی۔ ختم نبوت کی حقیقت اور اس معنی غامض کی صورت یہ ہے کہ مراتب توحید چار ہیں؛ آثاری، افعالی، صفاتی، ذاتی۔ انبیائے پیشیں صلوات اللہ علیٰ نبینا وعلیہم اعلانِ مدارج سہ گانہ پر مامور تھے۔ خاتم الانبیا کو حکم ہوا کہ حجابِ تعیناتِ اعتباری اُٹھا دیں؛ اور حقیقت بیرنگی ذات کو صورت الآن کما کان میں دکھا دیں۔ اب گنجینۂ معرفت خواص اُمت محمدی کا سینہ ہے؛ اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مفتاحِ بابِ گنجینہ ہے۔ رہے عامۂ مومنین کہ وہ اس کلام سے صرف نفی شرک فی العبادۃ مراد لیتے ہیں اور نفی شرک فی الوجود جو اصل مقصود ہے اُنکی نظر میں نہیں۔ مگر جب لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہیں گے اُسی توحید ذاتی کے اعتقاد کی قدمگاہ پر آرہیں گے یعنی ہماری اس کلمے سے وہ مراد ہے جو خاتم الرسل کا مقصود تھا۔ یہی حقیقت ہے شفاعت محمدی کی، اور یہی معنی ہیں رحمۃ للعالمین ہونے کے، اور اسی مقام سے ناشی ہے نمایے روح افزائے "من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ"۔

قلم اگرچہ دیکھنے میں دو زبان ہے لیکن وحدتِ حقیقی کا رازداں ہے۔ گفتگوئے توحید میں وہ لذت ہے کہ جی چاہتا ہے کوئی سو بار کہے اور سو بار سنے۔ نبی کی حقیقت ذو جہتین ہے، ایک جہتِ خالق کہ جس سے اخذِ فیض کرتا ہے اور ایک جہتِ خلق کہ جس سے فیض پہنچاتا ہے۔

نبی را دو وجہ ست دلجوئے خلق — یکے سوی خالق یکے سوی خلق

بداں وجہ از حق بود مستفیض — بدیں وجہ بر خلق باشد مفیض

یہ جو صوفیہ کا قول ہے کہ "الولایۃ افضل من النبوۃ"، معنی اسکے صاف اور از روے انصاف یہ ہیں

کہ ولایت نبی کی وہ وجہ الی الحق ہے افضل ہے نبوّت سے کہ وہ وجہ الی الخلق ہے ۔ نہ یہ کہ ولایت عام افضل ہے نبوت خاص سے ۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اُسی طرح ولی مستنیر ہے انوارِ نبوت سے ۔ مستنیر کی تفضیل مُنیر پر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں ۔ اب وہ ولایت کہ خاصۂ نبی تھا نبوّت کے ساتھ منقطع ہوگئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکوٰۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے نقل وتحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے ۔ اور یہ سراج ایزدی تا صبح ظہورِ قیامت روشن رہیگا ۔ اور اب اسی کا نام ولایت اور یہی مشعلِ طریق ہدایت ہے ۔ ولایت وہدایت وہی حقیقت توحید ذاتی ہے کہ جوار ردِّ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ مشہود عیونِ اعیانِ اُمت اور منظورِ نظرا کا بر ملت ہوئی ہے ۔ مگر وہ بات اب کہاں کہ ایک بار لا الٰہ الا اللہ کہے اور دل نورِ معرفت سے منور ہو جاوے ۔ اور وہ ضامنِ زبردست کہاں کہ قائلِ لا اِلٰہ الا اللہ کو اگرچہ اُسکے معنی اچھی طرح نہ سمجھا ہو قدمگاہ توحید پر قائم کردے ، یعنی رسولِ مقبول واجب التعظیم قائل انا احمد بلا میم علیہ التحیۃ والتسلیم ۔ اب سعادت بقدرِ ارادت ہے اور راحت بعدِ جراحت سچ بھی تو ہے ، آدمی کیونکر سمجھ سکے اور بطلانِ بدیہیات کے جواز پر اُسکو کیونکر تسلی ہو ، یعنی اس مجموعِ موجودات کو کہ افلاک وانجم وبحار وجبال اسی ہیں ہیں نیست ونابود محض جان لے اور تمام عالم کو ایک وجود مان لے ۔

اے کردہ بہ آرائشِ گفتار بسیچ | در زلفِ سخن کشودہ راہِ خم وپیچ
عالم کہ توحیز دیگرش سے دانی | ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ

جب اولیاء اللہ نے ۔ کہ وہ اطبّاء روحانی ہیں ۔ دیکھا کہ نفوسِ بشری پر وہم غالب ہے اور بسبب

استیلاءِ وہم کے مشاہدۂ وحدتِ ذات سے محروم رہے جاتے ہیں ؛ ہرچند اُنکو سمجھائیں گے ، راہ پر نہ آئینگے ۔ ناچار اشغال واذکار وضع کیے تا قوت تخیلہ اُسمیں اُلجھی رہے اور رفتہ رفتہ بیخودی طاری ہو جاوے ۔ وحدت وجود اِس طرح کی بات تو نہیں کہ نہ ہو اور ہم اُسکو بجبر یا بہ تکلف ثابت کیا چاہتے ہوں ۔ ذاتی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست ؀

وہم صورتگری اور پیکر تراشی کر رہا ہے اور معدومات کو موجود سمجھ رہا ہے پس جب وہ وہم شغل وذکر کی طرف مشغول ہو گیا بے شبہہ اپنے کام سے یعنی صورتگری اور پیکر تراشی سے معزول ہو گیا ۔ بیخبری اور بیخودی چھا گئی اور وہ کیفیت جو موحدین کو بمجرد فہم حاصل ہوتی ہے اس شاغل کے نفس کو بیخودی میں آ گئی ۔ ایک دریا میں جان کر کودا ؛ ایک کو کسی نے غافل کر کے دھکیل دیا ۔ انجام دونو کا ایک ہے وہ لوگ جو وحدت وجود کو سمجھ لیں یہ میں نہیں کہتا کہ نہیں ہیں ، مگر ہاں کم ہیں ، اور مخفی ہیں ، اور کہیں کہیں ہیں ۔ اور ایسے نفوس کہ جو کسبِ حالتِ بیخودی کے واسطے محتاج اشتغال واذکار ہیں ، بہت ہیں بلکہ بے شمار ہیں ،،